بھارت میں اردو کا المیہ

مرکنڈے کٹجو / نیاز سواتی*

جسٹس مرکنڈے کٹجو ۲۰ ستمبر ۱۹۴۶ء لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ان کا تعلق ایک معزز پنڈت کشمیری خاندان سے ہے۔ان کے والد ایس این کٹجو عدالت عالیہ الٰہ آباد کے جج رہے اور ان کے دادا ڈاکٹر کیلاش ناتھ کٹجو ملک کے مشہور قانون دان اور جدوجہد آزادی کے کارکن بھی رہے اور آزادی کے بعد ڈاکٹر کے این کٹجو مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ اور مغربی بنگال واوڑیسہ کے گورنر بھی رہے۔جسٹس مرکنڈے کے چچا بی این کٹجو عدالت عالیہ الٰہ آباد کے چیف جسٹس رہے ہیں۔

جسٹس مرکنڈے کٹجو عدالت عالیہ الٰہ آباد کے جج بننے سے قبل عدالت عالیہ دہلی اور مدراس ہائی کورٹ کے چیف جسٹس رہے اور عدالت عالیہ الٰہ آباد کے قائم مقام چیف جسٹس بھی رہے۔

جسٹس مرکنڈے کو اپنی کتاب (Mimansa Rules of Interpretation) پر لال بہادر شاستری یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی۔وہ دہلی کی نیشنل یونی ورسٹی اور ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نیشنل لاء یونی ورسٹی کے اعزازی پروفیسر رہے مگر جسٹس کٹجو کا اصل میدان قانون اور سیاست ہی قرار پایا ہے۔جسٹس مرکنڈے، پریس کونسل آف انڈیا کے چیئرمین بھی رہے۔

جسٹس مرکنڈے کٹجو بحیثیت جج انتہائی منصف مزاج اور قابل جج رہے۔ان کا کمرہ عدالت اپنی تیز ترین کارروائی کی وجہ سے مشہور رہا۔آپ عدالت اور قانون پر اپنے یقین کی وجہ سے دوسرے جج حضرات سے ممتاز رہے۔ایک قابل قدر جج کے علاوہ آپ کئی کتابوں اور مقالوں کے مصنف بھی ہیں۔آپ کی کتابوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

1. Law in the Scientific Era
2. Interpretation of Taxing Statutes
3. Mimansa Rules of Interpretation
4. Domestic Enquiry
5. Justice with Urdu

اس کے علاوہ آپ کی مشہور تقاریر اور مقالات درج ذیل ہیں:

1. Injustice to Urdu in India, published in the Tribune on 3 August 2008
2. Sanskrit as a language of Science, speech delivered in the Indian Institute of

* استاد، شعبہ اردو، گورنمنٹ اسلامیہ کالج، کراچی، مقیم کراچی

Science,Bangalore on 13 October 2009

3. Kalidas-Ghalib Academy for Mutual Understanding
4. The Role of Art, Literature and Media
5. Looking back at the Caste System
6. The Ideal of Women's emancipation
7. Importance of Liberty and Democracy in India Global Economic Scenario
8. The Hart-Fuller Debate by Justice Markandey Katju - Judge, Allahabad High Court
9. The Role of Media in India

بھارت میں اردو کے ساتھ برتا جانے والا رویہ ناگفتہ بہ ہے۔ یہ سلوک اس عظیم زبان کے ساتھ ہورہا ہے جو جدید بھارت میں بہترین شاعری پیش کرچکی ہے یعنی وہ شاعری جس نے میر (۱۷۳۲ء۔ ۱۸۱۰ء)، غالب (۱۷۹۷ء۔ ۱۸۶۹ء)، فراق (۱۸۹۶ء۔ ۱۹۸۲ء) اور فیض (۱۹۱۱ء۔ ۱۹۸۴ء) کی لازوال شاعری کی شکل میں ظہور کیا۔ اردو، ہندوستان کی روشن ثقافت کے خزانے کا نظر انداز کردہ انمول موتی ہے جسے مشکوک نظروں سے دیکھا جارہا ہے۔ میں اس سے بڑی حماقت کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔

اس ناانصافی کی بنیاد دو غلط تصوّرات پر ہے۔ پہلا یہ کہ اردو ایک غیر ملکی زبان ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ صرف مسلمانوں ہی کی زبان ہے۔ ان دونوں میں پہلا خیال صریحاً غلط ہے۔ بلاشبہ عربی اور فارسی غیر ملکی زبانیں ہیں (ان دونوں زبانوں کی دیگر زبانوں کی طرح بہت قدر کرتا ہوں) مگر اردو ایک ہندوستانی زبان ہے جس نے یہاں لشکر و بازار کی زبان کے طور پر جنم لیا ہے[1]۔ اپنی سادہ ترین شکل یعنی کھڑی بولی اور ہندوستانی کے طور پر اردو، شہری ہندوستان کے بڑے حصے میں عام آدمی کی زبان ہے۔ یہ زبان اپنے نمایاں ترین صورتوں میں یہیں رہی اور ہماری ثقافت میں یہ غیر معمولی حصے کی مالک ہے۔ اردو یہاں کے لوگوں کے مسائل کا حل، ان کے درد کا مداوا اور ان کے دل کو چھو لینے والی زبان ہے۔ صرف جہلا ہی اردو کو غیر ملکی زبان کہہ سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں دوسرا تصور بھی غلط ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے شہروں میں آباد ہماری نسل کے تمام پڑھے لکھے افراد کی زبان اردو تھی خواہ وہ ہندو، مسلم، سکھ ہوں یا عیسائی۔ میرے خاندان میں میرے والد صاحب کے زمانے تک ہر شخص اردو میں ماہر تھا۔ یہ صرف میری نسل تھی جو اردو سے محروم تھی۔ میں اس کو اپنی بدقسمتی سمجھتا ہوں۔

اپنے ثقافتی افتخار کی بحالی کے لیے میں نے بطور جج (عدالت عالیہ الہ آباد میں) میں ایک فیصلہ دیا[2]۔ اس فیصلے میں لکھا کہ ہر اسکول میں تیسری جماعت سے ساتویں جماعت تک سنسکرت اور اردو، ہماری دو عظیم ثقافتی زبانوں کو لازمی قرار دیا جائے۔ میری خیال میں دنیا کا کوئی ملک اپنے ثقافتی ورثے کو نظر انداز کر کے ترقی نہیں کرسکتا۔ میں یہاں اس امر کی

وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ میں صرف کشمیری پنڈتوں کو اپنے آباواجداد نہیں سمجھتا بلکہ میں کالی داس (پانچویں صدی عیسوی) اور امیر خسرو (۱۲۵۳ء۔ ۱۳۲۵ء) کو بھی اپنے اسلاف کا حصہ سمجھتا ہوں، میں اشوکا (متوفی ۲۳۲ قبل مسیح) اور اکبر (۱۵۴۲ء۔۱۶۰۵ء)، سورداس (۱۴۸۳ء۔ ۱۵۸۴ء) اور تلسی داس (۱۵۱۱ء۔ ۱۶۲۳ء) کو بھی اسی طرح اپنے آبائی وجود کا حصہ سمجھتا ہوں جس طرح میر اور غالب کو۔خونی وراثت کے مقابلے میں اصل وراثت ثقافت ہوتی ہے۔

یہ خیال کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے دراصل ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کے استعماری اصول کا نتیجہ ہے۔ان استعماری مفادات کا تقاضا تھا کہ ہندو اور مسلم ایک دوسرے سے لڑتے رہیں۔اسی طرح یہ نظریہ بھی گھڑا گیا کہ ہندی صرف ہندوؤں کی زبان ہے اور اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے شہری علاقوں میں عام آدمی کی زبان کھڑی بولی یا ہندوستانی ہے جس کی مفرس شکل اردو ہے اور اسی کھڑی بولی کی سنسکرت کے اثرات سے مملو زبان ہندی کہلاتی ہے۔

ہندوستان میں اردو کو قومی سطح پر پذیرائی حاصل ہے کیوں کہ یہ تیرہ ریاستوں میں بولی جاتی ہے۔اس بات کی وضاحت کے لیے میں ذاتی تجربہ بیان کرسکتا ہوں۔ جب جناب جیون ریڈی صاحب الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس (بعدازاں جج عدالت عظمیٰ) بنے تو انھوں نے مجھ سے کھڑی بولی (اردو کی ابتدائی صورت) میں بات کی۔ میں نے ان سے استفسار کیا کہ ان کا تعلق آندھرا پردیش سے ہے تو وہ کس طرح اتنی اچھی کھڑی بولی بول لیتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ حیدرآباد دکن میں ہر شخص اردو بول سکتا ہے۔جیون ریڈی صاحب نے یہ بھی یہ بتایا کہا کہ میں نے یونی ورسٹی کی سطح تک اردو میں ہی تعلیم حاصل کی ہے۔

جو لوگ اردو کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے میں ان کے سامنے اردو کی بنیادی خصوصیات پیش کرتا ہوں۔اردو زبان کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب کھڑی بولی کی بنیادوں پر فارسی کی چند خصوصیات اور اس کے ذخیرۂ الفاظ کا اثر پڑا لہٰذا اردو زبان، ہندوستانی اور فارسی کے ملاپ سے وجود میں آئی ہے۔اسی لیے ایک زمانے میں اسے ''ریختہ'' بھی کہا جاتا تھا جس کے معنی مخلوط زبان کے ہیں ۳۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اردو، فارسی اور ہندوستانی کے ملاپ سے بنی ہے۔یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اردو کوئی خاص قسم کی فارسی ہے یا ہندوستانی کی کوئی قسم ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اردو ایک خاص قسم کی ہندوستانی ہے نہ کہ خاص قسم کی فارسی مگر یہ خیال کچھ وضاحت طلب ہے۔

کوئی جملہ کس زبان سے تعلق رکھتا ہے اس امر کا فیصلہ مذکورہ جملے کے فعل کے ذریعے کیا جاتا ہے (نہ کہ اسم یا اسم صفت وغیرہ کے ذریعے)۔مثال کے طور پر میں کہتا ہوں: "Mr Ramm, you and your wife aaiye tommorow night for dinner at 8 p.m" یہ جملہ ہندی کا ہی کہلائے گا حالانکہ اس جملے میں سولہ الفاظ میں سے پندرہ الفاظ انگریزی کے ہیں۔ایسا کیوں ہے؟ اس جملے میں استعمال ہونے والا فعل یعنی ''آئیے'' ہندی کا ہے نہ کہ انگریزی کا۔

اردو کے تمام افعال روزمرہ کی سادہ ہندی (جو ہندوستانی یا کھڑی بولی کہلاتی ہے) کے ہیں۔ اردو کے زیادہ تر اسماء اور اسمائے صفت فارسی (یا عربی) کے ہیں مگر افعال صرف ہندوستانی کے ہوتے ہیں ۔ اگر اس جملے کا فعل فارسی کا ہوتا تو جملہ فارسی کا ہی کہلاتا نہ کہ اردو کا۔ اسی طرح اگر مذکورہ بالا جملے کا فعل اگر عربی ہوتا تو یہ عربی زبان کا جملہ کہلاتا [4]۔

اگر کسی بھی اردو شاعر کا کوئی شعر لے کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس کا فعل ہمیشہ سادہ ہندی کا ہی ہوگا (اگر چہ اسماء اور اسمائے صفت فارسی اور عربی کے ہوں گے)۔ مثال کے طور پر ہم غالب کا یہ شعر لیتے ہیں:

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت کی نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

یہاں ہمیں جو بالکل سادہ ہندی کے افعال دیکھو اور سنو ملتے ہیں جب کہ اسماء اور صفات فارسی کے ہیں۔ اسی طرح اگر ہم اردو شاعر کی کسی بھی نظم کا جائزہ لیں تو اس کے افعال ہمیشہ سادہ ہندی کے ملیں گے۔ لہٰذا اردو ایک خاص قسم کی ہندوستانی یا کھڑی بولی ہے نہ کہ خاص قسم کی فارسی۔ میں اس بات پر اسی لیے زور دے رہا ہوں کہ اگر اردو فارسی کی کوئی خاص قسم ہے تو پھر یہ ایک بیرونی زبان ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو ایک خاص قسم کی کھڑی بولی (یا ہندوستانی) ہے۔ یہ حقیقت کہ اردو دراصل کھڑی بولی یا ہندوستانی کی ایک قسم ہے اس امر کا اظہار ہے کہ اردو ایک مقامی اور دیسی زبان ہے۔

یہاں ہمیں چند باتیں کھڑی بولی (یا ہندوستانی) کے بارے میں جان لینی چاہئیں۔ کھڑی بولی وہ بنیاد ہے جس پر اردو کی عمارت تعمیر ہوئی ہے۔ کھڑی بولی سادہ بول چال کی ہندی ہے۔ یہ ادبی ہندی سے مختلف ہے جو مصنفین یا مقررین حضرات استعمال کرتے ہیں۔ کھڑی بولی ایک شہری زبان ہے۔ یہ ہندوستان کے ہندی بولنے والے علاقوں (اتر پردیش، بہار، راجھستان، مدھیہ پردیش، دہلی، ہریانہ اور ہماچل پردیش وغیرہ) کے عوام کی اولین زبان ہے اور ہندوستان کے غیر ہندی علاقوں میں عوام کی ثانوی زبان ہے اور پاکستان میں بھی ایسا ہی ہے۔

کھڑی بولی کیسے وجود میں آئی؟ اردو کو سمجھنے کے لیے یہ ایک بنیادی سوال ہے۔ دنیا کے تمام شہر پہلے پہل منڈیوں کی حیثیت سے ہی جانے گئے۔ یہ اسی وقت ممکن ہو سکا جب پیداواری قوتیں اس قدر طاقت ور ہوگئیں کہ لوگ اپنی ضرورت سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے لگے۔ اس طرح قدر زائد کی فروخت یا تبادلہ ضروری ہوگیا۔ دوسرے الفاظ میں تجارتی اشیاء کی تیاری شروع ہوگئی۔ جب تاجر اور خریدار حضرات نے خرید و فروخت کے مقام کا تعین کرلیا تو یہی مقام منڈی کہلایا۔ یہی منڈیاں بعد میں شہر بن گئیں۔ اب بیچنے اور خریدنے والوں کو ایک مشترکہ زبان کی ضرورت پڑی اس کے بغیر خرید و فروخت ممکن نہیں تھی۔ بازار کی ضرورت کی وجہ سے کھڑی بولی کا ظہور ہوتا ہے۔

یہاں میں ایک ذاتی تجربہ بیان کرتا ہوں۔ ایک تقریب میں شرکت کے لیے حیدرآباد (آندھرا پردیش) سے گلبرگہ (کرناٹک) تک مجھے بہ ذریعہ ٹیکسی جانا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور تیلگو زبان بولنے والا تھا۔ میرے ہمراہ گلبرگہ یونی ورسٹی

کے ایک پروفیسر بھی تھے جو کرناٹکی زبان بولنے والے ایک معزز آدمی تھے۔ یہ دونوں جنوبی ہند سے ہی تعلق رکھتے تھے مگر ایک دوسرے سے ہندی میں بات چیت کر رہے تھے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ وہ دونوں ہندی میں کیوں بات کر رہے ہیں؟ ان دونوں نے بتایا کہ ہندی ان دونوں کے درمیان رابطے کی زبان ہے۔

میں ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ میرا زیادہ تر وقت الٰہ آباد میں گزرا۔ یہاں شہر میں کھڑی بولی کا رواج ہے لیکن شہر کے اطراف میں اودھی [وہ زبان جس میں تلسی داس نے اپنی رام چرت مانس لکھی ۵] بولی جاتی ہے ۶۔ متھرا شہر میں کھڑی بولی کا چلن ہے۔ اس شہر کے چاروں طرف دیہاتی علاقے میں برج بھاشا (سورداس کی زبان) بولی جاتی ہے ۷۔ بنارس شہر اور اتر پردیش کے مشرقی شہروں میں کھڑی بولی کا رواج ہے مگر ان شہروں کے اطراف میں بھوج پوری بولی جاتی ہے ۸۔ شمالی بہار کے کچھ علاقوں میں میتھلی ۹] کا رواج ہے مگر یہاں بھی شہروں میں کھڑی بولی کا چلن ہے۔ راجھستان اور مدھیہ پردیش کے علاقے میں شہروں میں کھڑی بولی کا رواج ہے مگر دیہاتی علاقوں میں ایسی مقامی بولیوں کا رواج ہے جنہیں باہر کے رہنے والے نہیں سمجھ سکتے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی ہند کی دیہی آبادی مختلف مقامی بولیاں بولتی ہے مگر شہری آبادی کی مشترکہ زبان کھڑی بولی ہی ہے۔ مگر یہ کس طرح ممکن ہوا؟ آیئے دیکھتے ہیں۔ یہ اس طرح ہوا کہ ہندوستان میں (پیداواری قوتوں کے ارتقا کے نتیجے میں) بڑے پیمانے پر منڈیاں تشکیل پا گئیں۔ یہ سب کچھ مغلوں کی آمد سے بہت پہلے ہی ہو چکا تھا۔ ایک تاجر کے لیے بہت آسان تھا کہ وہ بہار یا مدھیہ پردیش سے سفر کرتے ہوئے اپنا سامان اتر پردیش، راجھستان اور پنجاب میں آسانی سے فروخت کر سکے۔ ان جگھوں پر اسے اپنی شناسا کھڑی بولی سے واسطہ پڑتا تھا جسے خریدار اور تاجر دونوں جانتے تھے۔ اگرچہ منڈی میں تاجروں کے خریدار مقامی بولیاں بھی بول رہے ہوتے تھے۔ اس طرح کھڑی بولی ہندوستان کے بڑے حصے میں شہری علاقوں کی زبان بن گئی۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے کئی غیر ہندی علاقوں میں بھی کھڑی بولی ثانوی زبان کے طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص کلکتہ، بنگلور، گجرات، لاہور یا کراچی بلکہ جنوبی ہند کا بھی سفر کرے تو بھی وہ ان شہروں کے عوام سے کھڑی بولی میں بات چیت کر سکتا ہے۔ البتہ دیہاتی علاقوں میں اسے مشکل پیش آئے گی۔

اب کھڑی بولی کی نوعیت کو سمجھتے ہوئے ہم اردو کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ کھڑی بولی کی بنیادوں پر فارسی کے عمل دخل نے اردو کو جنم دیا۔ یہاں اس بات کی وضاحت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ صدیوں تک ہندوستان کی درباری زبان فارسی رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی فارس میں فردوسی (۹۴۰ء۔۱۰۲۰ء)، حافظ (۱۳۵۱ء۔۱۳۹۰ء)، سعدی (۱۲۱۰ء۔ ۱۲۹۲ء)، رومی (۱۲۰۷ء۔ ۱۲۷۳ء) اور عمر خیام (۱۰۴۸ء۔۱۱۳۱ء) کے طفیل فارسی کی ترقی یافتہ شکل سامنے آ چکی تھی۔ یہ زبان تہذیب وثقافت اور اعلیٰ معیار کی حامل تھی۔ اپنی ان خصوصیات کی وجہ سے یہ زبان مشرق کے بڑے علاقے میں پھیل گئی۔

مغل ایرانی نہیں ترک تھے مگر انھوں نے فارسی کو درباری زبان کے طور پر قبول کرلیا کیوں کہ فارسی زبان ترکی کی نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ اگرچہ بابر (۱۴۸۳ء۔۱۵۳۰ء) نے خودنوشت سوانح عمری ''تزکِ بابری'' ترک زبان میں تحریر کی مگر اس کے بیٹے اکبر نے اسے فارسی میں ترجمہ کرواکر ''بابر نامہ'' کا نام دیا۔ اکبر کی اپنی سوانح عمری ''اکبر نامہ'' ابوالفضل (۱۵۵۱۔۱۶۰۲ء) نے فارسی میں لکھی۔ اسی طرح بعد میں اکبر کے بیٹے جہانگیر (۱۵۶۹ء۔۱۸۲۷ء) اور شاہ جہاں (۱۵۹۲ء۔۱۶۶۶ء) نے اپنی اپنی سوانح عمریاں بالترتیب جہانگیر نامہ اور شاہ جہان نامہ کے ناموں سے فارسی میں لکھوائیں۔

اس طرح ایک بیرونی زبان یعنی فارسی طبقہ اشرافیہ کی زبان قرار پا گئی اور شاہی دربار بھی اس عمل سے مستثنیٰ نہ رہے۔ اس کو اس طرح سمجھیں کہ نپولین کے حملے اور اس کے بعد تک بھی جرمنوں اور روسیوں کے طبقۂ اشرافیہ کی زبان فرانسیسی تھی۔ اس بات کی شہادت لیوٹالسٹائی (۱۸۲۸ء۔۱۹۱۰ء) کی کتاب وار اینڈ پیس سے بھی ملتی ہے۔ دور کیوں جائیں آج ہندوستان کے طبقۂ اشرافیہ کی زبان انگریزی ہے۔

فارسی صدیوں تک عدالت اور دربار کی زبان رہی۔ فارسی نے ہندوستانی شہروں کی زبان یعنی کھڑی بولی پر اپنے گہرے اثرات چھوڑے۔ اردو کی تشکیل کیسے ہوئی؟ یہ ایک دل چسپ سوال ہے۔ یہاں میں نے اس کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

بابر سے عالمگیر (۱۶۹۹ء۔۱۷۵۹ء) تک تمام اولین بادشاہ، ہندوستان کے بڑے حصے کے طاقت ور حکمران تھے مگر ان کے جانشین اپنے گزرے ہوئے آباء کی شان وشوکت کے برائے نام وارث تھے۔ اسی لیے کسی ستم ظریف نے کہا:

سلطنتِ شاہ عالم
از دہلی تا پالم

آخر میں آنے والے مغل حکمران برائے نام بادشاہ تھے۔ درحقیقت وہ قلاش تھے۔ وہ اپنی سلطنت انگریزوں، مرہٹوں اور اپنے گورنروں کے ہاتھوں گنوا چکے تھے۔ یہ سب لوگ اپنی اپنی جگہ (نوابِ اَودھ اور نظامِ حیدرآباد دکن کی طرح) آزاد حکمران بن چکے تھے۔ اب مغلوں کے دربار کی زبان فارسی نہ رہی بلکہ اردو نے اس کی جگہ لے لی۔

آخر یہ ہوا کیسے کہ عظیم مغل بادشاہوں کے زمانے میں دربار کی زبان یعنی فارسی موقوف کردی گئی اور اس کی جگہ اردو رائج ہوگئی؟ یہ اس لیے ممکن ہوسکا کہ بعد میں آنے والے مغل بادشاہ حقیقی حکمران نہ تھے بلکہ ان کی حالت عام آدمی بلکہ اس سے بھی بدتر تھی اور وہ ایک عام آدمی کی سی مشکلات کا سامنا کررہے تھے۔ اب انھیں ایک عام آدمی کی زبان کا ہی سہارا درکار تھا۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں انھوں نے شہری عوام کی زبان کھڑی بولی کو اپنے دربار میں کیوں نہ

اپنالیا؟ یہ اس لیے نہ ہوسکا کہ مغل بادشاہ، ان کے وزرا اور نوابین نے اپنی کس مپرسی کے باوجود اپنی عزت نفس اور وقار پر کوئی سمجھوتا نہ کیا۔ وہ اب بھی اپنے آپ کو تیموری شہزادے کہلاتے تھے یعنی تیمور کی اولاد۔ تیمور (۱۳۳۶ء۔ ۱۴۰۵ء) ایک عظیم فاتح اور بابر کے دادا کے جدامجد تھے۔ اب عام آدمی کی سی حالت کو پہنچ جانے کے باوجود مغل اس بات کے لیے تیار نہ تھے کہ انھیں ایک عام آدمی کی طرح سمجھا جائے۔ فارسی کو ترک کرنے کے بعد بھی انھوں نے کھڑی بولی کی جس قسم کو اختیار کیا وہ عام آدمی کی کھڑی بولی نہ تھی بلکہ یہ وہ کھڑی بولی تھی جو فارسی کی تہذیبی مہک، روایت اور شان وشوکت سے آراستہ تھی۔ دوسرے الفاظ میں وہ ایک ایسی کھڑی بولی بول رہے تھے جو فارسی کے اعلیٰ معیار، تہذیب اور ذخیرۂ الفاظ سے جڑی تھی۔

اردو اس اشرافیہ کی زبان تھی جو قلاش تو ہو چکی تھی مگر اس نے اپنی عزت اور وقار کو ان حالات میں بھی برقرار رکھا ہوا تھا۔ اردو کے عظیم شاعر مرزا اسداللہ خاں غالب کا واقعہ مشہور ہے کہ انھوں نے اپنی غربت کے باوجود پروفیسری کی نوکری محض اس لیے ٹھکرادی کہ جب وہ نوکری کرنے کالج پہنچے تو ان کی پیشوائی کے لیے انگریز پرنسپل خود نہیں آیا۔ اردو بولنے والوں کی عزت نفس کی ترجمانی جوش ملیح آبادی (۱۸۹۸ء۔ ۱۹۸۲) نے اس شعر کے ذریعے کی۔

حشر میں بھی خسروانہ شان سے جائیں گے ہم
اور اگر پرسش نہ ہوگی تو پلٹ آئیں گے ہم

اس طرح اردو طبقۂ اشرافیہ اور عوام دونوں کی زبان قرار پاتی ہے۔ یہ عام آدمی کی زبان ہے کیوں کہ متاخرین مغل بڑی حد تک عام آدمی کی حالت تک پہنچ چکے تھے کیوں کہ ان کی سلطنت چھن چکی تھی۔ یہ خواص کی زبان بھی تھی کہ اپنی کس مپرسی کے باوجود مغل، عام آدمی کی طرح سلوک کیے جانے پر تیار نہ تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ ان سے اب بھی اشرافیہ کی سی شان و شوکت برتی جائے۔ اس طرح اردو دوہری فطرت کی مالک ہے۔ یہ ایک طرف طبقۂ اشرافیہ کی زبان ہے تو دوسری طرف عام آدمی کی زبان (کھڑی بولی) بھی ہے۔ بظاہر یہ بات عجیب لگتی ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ اردو ایک طرف عام آدمی کی زبان ہے جو اس کے دکھوں، مسائل اور امیدوں کی ترجمان ہے تو دوسری طرف یہ طبقۂ اشرافیہ کی عظمت، شان اور تہذیب وشائستگی کی خصوصیات بھی رکھتی ہے۔

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اردو دو زبانوں ہندوستانی (یا سادہ ہندی) اور فارسی کا مرکب ہے۔ پہلی زبان عوام کی ہے اور دوسری طبقۂ اشرافیہ کی۔ یہ بات بھی بیان کی جا چکی ہے کہ اردو اپنے ہندی افعال کی بنا پر ایک خاص قسم کی ہندوستانی ہے نہ کہ فارسی کی کوئی قسم۔ اسی تجزیے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اردو کا مواد اگر عام آدمی کے خیالات اور اس کی تکالیف پر مشتمل ہو تب بھی اس کا اظہار انتہائی اعلیٰ سطح پر ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اردو عام آدمی کے دکھ درد، مشکلات، امیدوں اور مقاصد کا اظہار کرتی ہے مگر اس کا انداز بیان عمومی نوعیت نہیں رکھتا بلکہ اردو ان تمام جذبات و

احساسات کے اظہار کو اپنے اعلیٰ اسلوب کی بنا پر رفعت عطا کرتی ہے۔ مثال کے طور پر اردو کے عظیم ترین شاعر مرزا غالب عام آدمی کی سی تکالیف، مسائل اور دکھوں کا شکار ہوئے اور انھوں نے ان جذبات کو اپنے کلام میں سمویا بھی۔ طبقۂ اشرافیہ کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے غالب کی شدید خواہش تھی کہ ان کے ساتھ خواص والا سلوک کیا جائے۔ ان کی شاعری اپنے فطری انداز اور جدّت کی وجہ سے منفرد نظر آتی ہے۔ غالب کا پختہ خیال تھا کہ شاعری کی زبان عام بول چال کی زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ بہرحال غالب نے اکثر اپنے خیال کا اظہار براہ راست کرنے کے بجائے استعارے اور کنائے میں کیا ہے۔

اردو کے دیگر کئی شعرا کا طرز بھی یہی رہا ہے۔ وہ اپنے خیالات اور احساسات کا اظہار سادہ اور براہ راست زبان میں نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اشارے کنائے اور حوالے کے ذریعے کرتے تھے۔ یہ سب اس لیے ہوتا تھا کہ وہ کسی کم تر حیثیت کے بجائے معزز، شریف، اور متمدن نظر آئیں۔ یہ چیز بعض اوقات ابہام پیدا کرتی ہے۔ اسی لیے اردو کے مشہور نقاد اور سوانح نگار الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ء۔ ۱۹۱۴ء) نے غالب کے ایک تہائی اشعار کی تفہیم کو مشکل قرار دیا ہے۔ اسی لیے ان اشعار کے کئی کئی معانی لیے جاسکتے ہیں۔

جب تک مغل حکمران ہندوستان میں طاقت ور رہے فارسی ہی دربار و عدالت کی زبان رہی اور اردو کو یہ مقام حاصل نہ ہوسکا اور نہ ہی شمالی ہند میں سرکاری زبان کا رتبہ اسے ملا۔ اس کے بجائے اردو کو اپنا مسکن جنوبی ہند اور گجرات میں ملا جہاں وہ طبقہ اشرافیہ کی زبان تھی۔ ایک لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو کا آغاز جنوبی ہند سے ہوتا ہے اور عظیم مغل حکمرانوں کے دور میں اردو کو یہیں مقبولیت حاصل ہوئی۔ گول کنڈہ، بیجاپور، احمد نگر وغیرہ کی سلطنتوں میں اسے سرکاری سرپرستی حاصل ہوئی۔ ان مقامات پر اردو کو دربار کی زبان کا اعزاز حاصل رہا۔ مگر اردو اس دوران شمال میں سے فارسی کو بے دخل نہ کرسکی۔ اس زمانے میں شمالی ہند میں اردو زبان کو کم تر زبان کے سمجھا جاتا تھا۔ یہ زمانہ اردو کی شمالی ہند سے خفگی کا زمانہ تھا۔ اسی زمانے میں اردو نے جنوبی ہند اور گجرات کے طبقہ اشرافیہ میں زبردست مقبولیت حاصل کر لی۔ اس حوالے یہ بات بڑی دل چسپ ہے کہ جب اردو کے عظیم شاعر ولی دکنی (۱۶۶۷ء۔ ۱۷۰۷ء) جب ۱۷۰۰ء میں عالم گیر (۱۶۱۸ء۔ ۱۷۰۷ء) کی حکومت کے دوران دہلی گئے تو انھیں معلوم ہوا کہ ان کی شہرت ان سے پہلے ہی دہلی پہنچ چکی تھی اور وہ دہلی میں خاصے مقبول تھے۔ دراصل ان کی شاعری اردو زبان میں ہونے کی وجہ سے یہاں کے عام آدمی کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں دہلی کے شعرا تمام تر شاعری فارسی زبان میں کر رہے تھے جو عام آدمی کی سمجھ سے باہر تھی۔ ولی دکنی جنوبی ہند سے تعلق کے باوجود اردو شاعری کے باوا آدم سمجھے جاتے ہیں کیوں کہ انھوں نے دہلی کے شعرا کو اردو میں شاعری کی طرف راغب کیا۔ اس اردو زبان کی طرف جو وہاں کا عام آدمی آسانی سے سمجھ سکتا تھا۔ ولی کے اس کارنامے نے اردو کی عظمت کو چار چاند لگا دیے۔

۱۷۰۷ء میں عالمگیر کی وفات کے بعد کم زور مغل حکمرانوں کا دور شروع ہوتا ہے۔اس دور میں رفتہ رفتہ اردو نے فارسی کو ہٹا کر اس کی جگہ لینا شروع کر دی مگر فارسی کی جگہ اردو کی آمد کو ہچکچاہٹ کے ساتھ قبول کیا گیا۔اس کی مثال خود مرزا غالب ہیں۔غالب اپنی فارسی شاعری کو وقیع جانتے تھے اور اردو شاعری کو کمتر سمجھتے تھے (حالانکہ ان کی اصل عظمت کا راز ان کی اردو شاعری ہے)۔غالب نے اپنے دوست منشی شیونرائن کے نام اپنے ایک خط میں غالب نے لکھا: ''میرے دوست میں اردو میں کیسے لکھ سکتا ہوں؟ کیا میرے حیثیت اس قدر گئی گزری ہے کہ مجھ سے اس بات کی توقع کی جائے گی''۔

ان دنوں اردو میں لکھنے کو کم تر سمجھا جاتا تھا اور اس زمانے کے تمام بڑے لکھاری فارسی میں لکھتے تھے۔یہاں میں ایک اور مثال دے سکتا ہوں۔میرے جدامجد پنڈت منسارام کٹجو ۱۷۷۵ء میں کشمیر سے آئے۔انھوں نے کرک شترا میں ایک اندراج اس طرح کیا ہے [۱۱]۔

''بہ تلاش معاش آمد''

اس کا مطلب تھا ''میں یہاں روٹی کی تلاش میں آیا ہوں۔'' مطلب یہ کہ وہ نوکری کی تلاش میں آئے تھے۔یہ نوکری انھیں مغربی مدھیہ پردیش میں جورہ کے نواب کے دربار میں ملی۔یہ بڑی دل چسپ بات ہے کہ انھوں نے یہ عبارت اردو کے بجائے فارسی میں لکھی۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں پڑھے لکھا طبقہ تحریر کے لیے فارسی استعمال کرتا تھا۔اردو اس وقت عام بول چال زبان تھی مگر تحریری زبان بہرحال فارسی ہی تھی۔

غالب جو اپنے ترک آبا واجداد پر فخر کرتے تھے اردو لکھنے میں ہچکچاہٹ کا شکار رہے اور فارسی لکھتے رہے۔حتیٰ کہ ان کی ابتدائی شاعری بہت زیادہ مفرس اور مشکل تھی۔ان کی بہترین شاعری ان کے آخری دور کی شاعری ہے جب انہوں نے کھڑی بولی کا استعمال زیادہ کرنا شروع کیا۔

مغلیہ سلطنت کا زوال اردو کے لیے زحمت کے بھیس میں نعمت ثابت ہوا۔اردو کے لیے صرف اس وقت یہ ممکن ہوسکا کہ وہ فارسی کو دربار اور عدلیہ سے نکال کر اس کی جگہ لے لے۔آخری مغلوں کا دور، اردو کے عروج کا زمانہ تھا۔بہادر شاہ ظفر (۱۷۷۵ء۔۱۸۶۲ء) کے دور میں اردو کا سورج اپنے نصف النہار پر تھا۔

۱۹۴۷ء تک اردو دربار اور عدالتوں سمیت ہندوستان کے پڑھے لکھے لوگوں کی زبان تھی۔اسی دوران اپنی دہری شان کی وجہ سے اردو نے شہری ہندوستان کے عام آدمی کی ترجمانی بھی کی۔شہری ہندوستان کے عام آدمی کی زبان ہونے کے ناطے اردو نے یہاں کی ہر زبان کے الفاظ اپنائے اور اس طرح کے الفاظ کی وجہ سے اردو پر کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا گیا۔عام آدمی کی زبان ہونے کے ناطے اسے عوام کے دلوں میں جگہ ملی بلکہ آج بھی عوام اپنے کے دلوں میں اس کے لیے محبت رکھتے ہیں۔اس امر کو مندرجہ ذیل تین حقائق سے واضح کیا جا سکتا ہے۔

ا۔ آج بھی ہندی فلموں میں اردو کے گیت گائے جاتے ہیں تاکہ دلوں کی آواز دل کی زبان میں ہی سنائی دے تو اچھا لگتا ہے۔اس کے باوجود کہ کئی لوگ اسے دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میری جوانی میں میری نسل یہ گانے گایا کرتی تھی۔

اے دل مجھے ایسی جگہ لے چل جہاں کوئی نہ ہو

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن

ہم بالکل نہیں جانتے تھے کہ یہ فلمی گانے دراصل مرزا غالب کے اشعار ہیں۔

۲۔ ریلوے کے بک اسٹالوں پر جو کتابیں بکتی ہیں وہ غالب ،میر، فیض، جوش ،فراق، حالی ، داغ(۱۸۳۱ء۔ ۱۹۰۵ء)، مجاز(۱۹۱۱ء۔ ۱۹۵۵ء) اور ذوق(۱۷۸۹ء۔ ۱۸۵۴ء) وغیرہ کی ہوتی ہیں نہ کہ ہندی شاعری کی کتب(یہ الگ بات ہے کہ آج کل یہی کتابیں فروخت ہوتی ہیں مگر دیوناگری رسم الخط میں)۔ہم انھیں ہندی کہتے ہیں،اردو نہیں جو کہ عوام کی زبان ہے، پھر ایسا کیوں ہے کہ ہندی شعرا مثلاً مہادیوی ورما(۱۹۰۷ء۔۱۹۸۷ء)،سمترا نندن پانت (۱۹۰۰ء۔۱۹۷۷ء) کی شاعری کی کتب ریلوے بک اسٹالوں پر نہیں بکتیں؟ جہاں سے عام لوگ کتابیں خریدتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہندی بولنے والے بھی اردو شاعری کی کتابیں خریدتے ہیں۔

۳۔ ایسے ہندی لکھاری جن کا پس منظر اردو کا ہے مثلاً منشی پریم چند(۱۸۸۰ء۔ ۱۹۳۶ء)،کرشن چندر(۱۹۱۴ء۔۱۹۷۷ء)،راجندر سنگھ بیدی(۱۹۵۱ء۔ ۱۹۸۴ء)، پروفیسر گوپی چند(۱۹۳۱ء)اور مالک رام(۱۹۰۶ء۔ ۱۹۹۳ء) ہندی دنیا میں زیادہ مقبول ہیں۔عوام اردو سے محبت کرتے ہیں کیوں کہ اردو نے عوام کے درمیان پرورش پائی ہے۔اردو کا ادب مزاحمتی ادب ہے۔ یہ مزاحمت ہے عام آدمی کے دکھوں اور ناانصافی کے خلاف۔ ذرا فیض کی اس نظم کا جائزہ لیں۔

نثار میں تری گلیوں پہ اے وطن کے جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر جھکا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے

یہ نظم پاکستان میں مارشل لا کی آمریت کے خلاف مزاحمت کا اظہار ہے۔اردو حب الوطنی کی زبان بھی ہے۔رام پرساد بسمل(۱۸۹۷ء۔۱۹۲۷ء) کے ان اشعار سے کون واقف نہیں:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے

اردو شاعری نے بے جا رسومات،تکلفات، جبر،دقیانوسی رواج کے خلاف احتجاج کیا ہے۔اس حوالے سے اردو کبیر (۱۳۹۸ء۔ ۱۵۱۸ء) کی شاعری کی وارث بھی ہے اور اس کے مقابلے میں بہت زیادہ علویت کی بھی حامل ہے۔ غالب نے لکھا:

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

یعنی مسلم کی تسبیح اور برہمن کی مالا بجائے خود کوئی اہمیت نہیں رکھتیں بلکہ اصل اہمیت تو شیخ و برہمن کی اپنے عقیدے سے

وفاداری میں ہے۔میں یہاں خاص طور پر سعادت حسن منٹو (۱۹۱۲ء۔۱۹۵۵ء) کے تقسیم ہند کی خوف ناک صورت کے موضوع پر لکھے گئے افسانوں کا بھی حوالہ دوں گا مثلاً ٹھنڈا گوشت۔

جدید ہندوستان میں عوامی زبان کی حیثیت سے اردو مکمل طور پر ایک سیکولر زبان کی حیثیت سے سامنے آتی ہے۔اس سلسلے میں ایک استثناء اقبال کی شاعری کے دوسرے حصے کو حاصل ہے جہاں وہ ہندوستانی قوم پرستی ترک کر کے پان اسلام ازم کی طرف چلے جاتے ہیں [۱۲]۔اردو کے کچھ عظیم شعراء نے مذہب بھی کے خلاف شاعری کی ہے۔اردو کے عظیم شاعر میر لکھتے ہیں:

میر کے دین و مذہب کو پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

اسی طرح غالب نے لکھا:

ایمان مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے تو کلیسا میرے آگے

یعنی ایمان مجھے روک رہا ہے اور کفر مجھے آگے کی طرف کھینچ رہا ہے۔کعبے میرے پیچھے ہے اور کلیسا میرے آگے آگے ہے۔یہاں کلیسا کا لفظ جدید تہذیب کے استعارے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔اردو کے دیگر کئی شاعروں کی طرح غالب قدیم جاگیردارانہ تہذیب کے خلاف ہیں اور جدیدیت کے حامی ہیں۔غالب مزید لکھتے ہیں۔

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے

یعنی غالب مسجد کے نیچے ہی شراب خانے کی خواہش کر رہے ہیں۔

اردو ادب پر صوفیا کے واضح اثرات ہیں۔صوفیا کا تعلق مسلمانوں کے انتہا پسندوں سے نہیں بلکہ یہ وسیع المشرب لوگ ہیں۔یہ تمام انسانیت کے درمیان مذہب اور ذات پات سے ماورا عالمی محبت کے قائل ہیں۔جدید اردو شعرا میں ساحر لدھیانوی (۱۹۲۱ء۔۱۹۸۰ء) کھلم کھلا دہریے تھے۔ان کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

عقائد وہم ہیں مذہب خیالِ خام ہے ساقی
ازل سے ذہنِ انساں بستِ اوہام ہے ساقی
حقیقت آشنائی اصل میں گم کردہ رہی ہے
عروسِ آگہی ، پروردۂ ابہام ہے ساقی

مطلب یہ ہے کہ عقیدہ اور مذہب خیالی چیزیں ہیں۔انسان کا ذہن شروع ہی سے وہم و گمان کا غلام رہا ہے اور حقیقت خود ابھی ابہام کے پردوں میں چھپی ہوئی ہے۔ساحر نے مزید کہا:

بے زار ہے کنشت و کلیسا سے جہاں

سوداگران ِ دین کی سوداگری کی خیر
شان جہاں میں رقص کناں ہیں تباہیاں
آقائے ہست و بود کی صنعت گری کی خیر
انسان الٹ رہا ہے رخِ جست سے نقاب
مذہب کے اہتمام ِ فسوں پروری کی خیر
الحاد کررہا ہے مرتب جہانِ نو
دیرو حرم کے حیلۂ غارت گری کی خیر

ساحر کا کہنا ہے کہ انسانیت مذہب کی ہر قسم سے تنگ آ چکی ہے۔دین کے نام پر دکان داری کرنے والے اپنی خیر منائیں۔پوری دنیا میں تباہی کا راج ہے جو اس جہان کے بنانے والے کی خلاقی پر سوال ہے۔انسان حقیقت کی نقاب کشائی کرر ہا ہے۔مذاہب اپنے تنتر منتر کی خیر منائیں۔الحاد دنیا کو نئے سرے سے ترتیب دے رہا ہے۔مسجد اور مندر اپنی پھیلائی ہوئی تباہی کی خیر منائیں۔

میں بڑی جرأت کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ دنیا کی کسی بھی زبان کی شاعری نے انسان کے دل کے دکھوں کی ترجمانی اس طریقے سے نہیں کی جو اردو شاعری کا خاصہ ہے۔مندرجہ ذیل شعر میں انسانی رنج والم کے اظہار کا منفرد انداز ملاحظہ ہو:

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہوگئیں

مطلب یہ کہ جب انسان اپنے آپ کو دکھوں کا عادی کر لیتا ہے تو دکھ بے اثر ہو جاتا ہے۔شاعر کا کہنا ہے کہ اس پر اس قدر تکالیف آئیں کہ اسے تکالیف سہنے کی عادت سے پڑ گئی ہے اور اب کوئی مشکل، مشکل نہیں لگتی۔اردو کے بے مثال شعرا میر تقی میر اور نظیر اکبرآبادی (۱۷۳۵ء۔۱۸۳۰ء) نے ہولی ،دیوالی ،راکھی اور دیگر ہندوانہ رسوم اور تہواروں پر خوب صورت نظمیں لکھیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کسی خاص عقیدے کی زبان نہیں۔ہندو ادبا کی بڑی تعداد کا نام اردو ادب کے صف اول کے لوگوں میں شامل ہے مثلاً فراق گورکھ پوری، چکبست (۱۸۸۲ء۔۱۹۲۶ء)، رتن ناتھ سرشار (۱۸۴۶ء۔۱۹۰۳ء) وغیرہ۔ولی دکنی (۱۶۶۷ء۔۱۷۰۷ء) کی شاعری میں گنگا، جمنا، کرشنا، سرسوتی، سیتا اور لکشمی جیسے الفاظ تواتر کے ساتھ ملتے ہیں۔

اردو شاعری جہاں ہندوستان کے تنوع کو ظاہر کرتی ہے وہیں یہ وحدتِ ہند کی بھی ترجمان ہے۔بے شمار لوگ اور برادریاں ہندوستان آئے اور یہیں جذب ہو گئے جیسا کہ فراق نے لکھا:

سرزمین ِ ہند پر اقوام عالم کے فراق
قافلے گزرتے گئے ہندوستان بنتا گیا

فراق کا کہنا یہ ہے کہ ہندوستان کی سرزمین پر آنے والی ہر قوم نے یہاں خیال وتحرک کے خزانوں میں اضافہ ہی کیا ہے جن کی بدولت ہندوستان ترقی کرتا گیا۔اردو کو سب سے بڑا دھچکا ۱۹۴۷ء کی تقسیم ہند میں پہنچا۔اس وقت سے اردو کو بیرونی زبان کہہ کر بدنام کیا گیا، وہ زبان جو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔اس کے نتیجے میں کئی مسلمانوں نے اپنی حب الوطنی ثابت کرنے کے لیے اردو کی آموزش ترک کردی تاکہ اپنے ہندو ہم وطنوں سے ان کی یک جہتی متاثر نہ ہو۔ ۱۹۴۷ء کے بعد فارسی کے عام فہم الفاظ منظم انداز میں بول چال سے غائب ہوتے چلے گئے اور ان کی جگہ نامانوس سنسکرت نے لے لی مثال کے طور پر عدالتِ عالیہ الٰہ آباد میں ایک مقدمے کی سماعت کے دوران میرے سامنے ایک درخواست ''پراتی بھو آویدان پترا'' کے عنوان سے آئی۔میں نے فاضل وکیل سے ''پراتی بھو'' کا مطلب پوچھا۔انھوں نے بتایا کہ اس کا مطلب ہے درخواستِ ضمانت۔میں نے وکیل سے کہا کہ وہ اسے اس لفظ کی جگہ ضمانت کا لفظ استعمال کرنا چاہیے تھا۔ایک اور موقع پر صبح کے وقت چہل قدمی کرتے ہوئے میں نے ایک بورڈ دیکھا جس پر تحریر تھا ''پراونن کندرا'' میں اس کا مطلب سمجھ نہیں سکا۔کچھ دور میں نے ایک اور بورڈ پر انگریزی میں لکھا تھا سلیکشن سنٹر۔میرے خیال میں یہاں ہندی الفاظ ''بھرتی دفتر'' یا ''روزگار دفتر'' لکھے جانے چاہیے تھے بجائے ''پراونن کندرا'' کے جسے کوئی نہیں سمجھتا۔

کھڑی بولی میں موجود فارسی کے عام فہم الفاظ کو نفرت انگیز طریقے سے ہٹانے اور ان کی جگہ سنسکرت کے نامانوس الفاظ لانے کی پالیسی کے نتیجے میں سنسکرت زدہ ہندی کو جنم دینے کا باعث بنی ہے جسے عام آدمی سمجھنے میں مشکلات کا شکار ہے۔عام طور پر ہماری عدالتوں میں سرکاری خطوط میں تحریر شدہ ہندی کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔فارسی الفاظ سے نفرت کی یہ پالیسی اردو کی نسل کشی کا بھی سبب بھی بنتی ہے۔

بہرحال تمام معاندانہ کوششوں کے باوجود دلوں کی آواز کو لوگوں کے دل سے دیس نکالا نہیں دیا جاسکتا، اس وقت تک جب تک دل ہمارے سینوں میں دھڑک رہے ہیں۔اردو لوگوں کے دلوں میں بستی ہے اس بات کا ثبوت کہ تو اردو کے مشاعرے بھی ہیں جو جہاں ہندوستانی عوام جوق در جوق کھنچے چلے آتے ہیں۔ان مشاعروں میں معاشرے کے تمام طبقات اور ہندوستان کے ہر حصے کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔اگر اردو ایک بیرونی زبان ہے تو یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ ہندوستانی عوام کی اکثریت ایک بیرونی زبان سے اس قدر پیار کرتی ہے۔

الٰہ آباد میں قائم ایک تنظیم ''سنسکرت اردو اکیڈمی'' کے قیام کا مقصد اردو اور سنسکرت ہماری ایسی دو زبانوں کو ترقی دینا ہے جو عظیم ثقافتوں کی حامل ہیں مگر فی زمانہ انہیں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔جب یہ تنظیم قائم ہوئی تو لوگوں نے کہا کہ اردو سنسکرت تو بڑا عجیب سا امتزاج ہے۔مگر کم لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ اردو میں استعمال ہونے والے ستر فی صد الفاظ سنسکرت کے ہیں۔سنسکرت اردو کی دادی ہے۔ہندوستان کی بقیہ زبانوں کا بھی سنسکرت سے یہی تعلق ہے۔اگر دادی اور پوتی ایک ساتھ چلیں گی تو دونوں کو فائدہ ہوگا [۱۳]۔

یہاں میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ یہ بھی ایک غلط فہمی ہے کہ سنسکرت ہندو مذہب کی زبان ہے(اسی طرح جیسے اردو کے بارے میں یہ غلط فہمی ہے کہ یہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے)۔ دراصل سنسکرت آزاد خیال مفکرین کی زبان ہے۔ سنسکرت کے مکاتب فکر کا سلسلہ حیرت انگیز طور پر گہری مذہبی فکر سے الحاد تک پہنچا ہوا ہے۔ عظیم ہندی لکھاری راہول سنسکریتایان (۱۸۹۳ء۔۱۹۶۳ء) نے لکھا کہ سنسکرت سیکھنے سے قبل وہ خدا پر ایمان رکھتے تھے مگر سنسکرت سیکھنے کے بعد وہ ملحد ہو گئے۔ قدیم بھارت کے عظیم سائنس دان آریہ بھاٹا (۴۷۶ تا ۵۵۰ قبل مسیح)، ششرک اور چرک سب کے سب نے سنسکرت کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ اسی طرح فلسفیوں، لغت کے ماہرین، ڈرامہ نویس اور شعرا نے بھی سنسکرت میں لکھا[14]۔

جو لوگ اردو زبان کا احیا کرنا چاہتے ہیں میری ان سے مخلصانہ درخواست ہے کہ وہ سنسکرت کے ساتھ مل کر چلیں اور اپنی راہ الگ نہ نکالیں۔ اس طرح اردو کو ایک فرقہ وارانہ زبان بھی قرار نہیں دیا جاسکے گا[15]۔ اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی تجویز کروں گا کہ اردو شعرا کے کلام کی اشاعت دیوناگری رسم الخط میں بھی کی جائے[16] (جیسا کہ پرکاش پنڈت نے کیا بھی ہے) تاکہ وہ لوگ جو فارسی رسم الخط سے واقف نہیں وہ بھی اسے پڑھ سکیں۔ میرے خیال میں کسی کو محض رسم الخط کے بارے میں اتنا غیر لچک دار موقف نہیں رکھنا چاہیے۔

ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کتاب کے بائیں ہاتھ والے صفحے پر اردو شاعری فارسی رسم الخط میں لکھی جائے اور دائیں ہاتھ والے صفحے پر وہی شاعری دیوناگری رسم الخط میں تحریر کی جائے اور مشکل الفاظ کے معانی ذیل میں سادہ ہندی (ہندوستانی) میں درج کر دیے جائیں[17]۔ آخر میں اردو اور ہندی کے ادبا سے گزارش کروں گا کہ وہ سادہ زبان استعمال کریں۔ اردو اور ہندی پڑھتے ہوئے قارئین کو بہت سے مشکل الفاظ سے واسطہ پڑتا ہے۔ اگر ادب سمجھ میں ہی نہ آسکے تو اس کا فائدہ کیا ہے؟ آج کل ہندوستانی عوام کو غربت، بے روزگاری اور مہنگائی کا سامنا ہے ادب کو ان مسائل سے نبرد آزما عوام کی جدوجہد میں اپنا حصہ ادا کرنا چاہیے۔ اس طرح کے ابلاغ کے لیے آسان زبان کی ضرورت ہے جس طرح زمانۂ جنگ میں ونسٹن چرچل (۱۸۷۴ء۔۱۹۶۵ء) کی تقاریر اور منشی پریم چند اور شرت چندرا (۱۹۳۵ء۔۲۰۰۰ء) کی کہانیوں کی زبان سادہ ہوا کرتی تھی۔

حوالہ جات:

۱۔ لشکر سے مصنف کی کیا مراد ہے؟ ہندوستان کا کوئی مقامی لشکر مراد ہے یا مغل لشکر؟ مغل لشکر والی بات سے ماہرین لسانیات عموماً متفق نہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو کے آغاز کے بارے میں موجود تمام نظریات کا جائزہ لیتے ہوئے لشکر کے نظریے سمیت سب کو بدلائل رد کر دیا ہے۔

۲۔ رمیش اپادھیا بمقابلہ ریاست اتر پردیش ۱۹۹۳ (۲) UPLBEC 945,R,

۳۔ ہندوستانی اور فارسی کے ملاپ کا لفظ غلط فہمی پیدا کرتا ہے۔کوئی زبان، دیگر زبانوں کے ملاپ سے وجود میں نہیں آتی البتہ دیگر زبانوں سے الفاظ کی آمد جاری رہتی ہے۔

۴۔ فارسی میں عربی کا دخل عربوں کی فتح ایران کے بعد ہوتا ہے۔عظیم فارسی شاعر فردوسی (مصنف شاہنامہ) عربی الفاظ کو فارسی میں سے نکالنا چاہتے تھے۔مگر وہ ناکام رہے۔حقیقت یہ ہے کہ کسی غیر زبان کے الفاظ اپنے اندر سمونے سے زبان طاقت ور ہوتی ہے نہ کہ کم زور،مثال کے طور پر انگریزی نے بیرونی زبانوں کو قبول کر کے اپنے آپ کو قوت فراہم کی ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

۵۔ تلسی داس اپنے مشہور ادبی کارناموں کی وجہ سے مشہور ہیں جن میں رام چرت مانس خاص طور پر قابل ذکر ہے۔یہ ایک طویل رزمیہ نظم ہے۔

۶۔ اودھی ایک ہند آریائی زبان ہے جو اتر پردیش کے علاقے اودھ میں بولی جاتی ہے۔اس کے علاوہ نیپال میں ہمالیہ کی ترائی میں بھی اس کے واضح اثرات ہیں۔

۷۔ برج بھاشا کا تعلق ہند آریائی زبانوں کے خاندان سے ہے۔ہندوستان کے شمال وسطی علاقوں اتر پردیش،راجھستان، دہلی اور ہریانہ میں برج بھاشا بولی جاتی ہے۔

۸۔ بھوج پوری، ہندوستان کے شمال مشرقی علاقوں اور نیپال میں ترائی کے علاقوں میں بولی جاتی ہے۔اس زبان کا زیادہ تر رواج مشرقی اتر پردیش،مغربی بہار، جھاڑکھنڈ کے شمال مغربی علاقوں میں ہے۔بھوج پوری، نیپال کی سرکاری زبانوں میں شامل ہے،اس کے علاوہ فجی، گوانا، سری نام اور موریشس کی منظور شدہ زبان ہے۔

۹۔ یہ وہ زبان ہے جس میں مشہور شاعر ودیا پتی (۱۳۵۲ء۔۱۴۴۸ء) نے شاعری کی۔میتھلی زبان بھوج پوری کی طرح ہند آریائی زبان ہے جو شمالی اور مشرقی بہار کے ساتھ ساتھ نیپال میں ترائی کے اضلاع میں بولی جاتی ہے۔یہ نیپال کی دوسری بڑی زبان ہے۔یہ کیتھی اور دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔

۱۰۔ اکبر کے وزیر خزانہ راجہ ٹوڈرمل نے مغلیہ سلطنت کی تمام تر مالیاتی کارروائی فارسی زبان میں مرتب کر رکھی تھی۔

۱۱۔ مغل دور کے فائر مین، سب کے سب اردو کے بجائے فارسی میں ہوا کرتے تھے۔جب میں چمبہ (ہماچل پردیش) کے میوزیم میں گیا جو پہلے ہندو حکمرانوں کا محل ہوا کرتا تھا۔وہاں میں نے مغل بادشاہوں کے فائر مین دیکھے جو اردو کے بجائے فارسی میں تحریر شدہ تھے۔

۱۲۔ محمد صادق، اے ہسٹری آف اردو لٹریچر، اشاعت دوم، ص ۴۶۱۔۴۶۵

۱۳۔ یہ مصنف کی رائے ہو سکتی ہے مگر دیکھا یہ گیا ہے کہ دورِ جدید میں زبانیں نئے ٹیکنالوجی یا مغربی تصورات کی وجہ سے یا تو انگریزی سے نئے الفاظ لے رہی ہیں یا اپنے مذہبی پس منظر کی حامل زبانوں سے نئے الفاظ اخذ کر رہی ہیں مثلاً ہندی میں نئے الفاظ سنسکرت سے اور اردو اپنے نئے الفاظ عربی اور فارسی سے لے رہی ہے۔اسی طرح انگریزی میں بھی جہاں دنیا بھر کی زبانوں سے نئے الفاظ انگریزی میں سموئے جا رہے ہیں وہیں ان الفاظ کا بڑا حصہ لاطینی سے اخذ کردہ الفاظ کا ہے جو عیسائیت کے مذہبی زبان ہونے کے لحاظ سے بھی اہمیت رکھتی ہے۔

۱۴۔ سنسکرت اپنی وسعت کے لحاظ سے موضوعات کا جتنا بھی تنوع رکھتی ہو بہر حال یہ بات نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ ہندو مذہبی ادب سارے کا سارا سنسکرت میں ہی موجود ہے۔اسی لیے سنسکرت کے بارے میں یہ تاثر عام ہوا ہے کہ یہ ہندو دھرم کی زبان ہے۔یہی معاملہ جس کے بولنے والوں کی اچھی خاصی تعداد عیسائی ہے مگر اسلام کے بنیادی ذرائع علم قرآن وحدیث کے علوم کا تمام تر ذخیرہ عربی زبان میں ہے۔ اس کے علاوہ اسلام کے مقدس مقامات اور اولین مخاطب بھی عربی تھے اس لیے عربی زبان پر اسلام کی گہری چھاپ لگی ہوئی ہے۔

۱۵۔ سنسکرت کے الفاظ جس غیر فطری طریقہ سے ہندی میں لائے جا رہے ہیں اس نے ان الفاظ کی تفہیم بھی ہندوستان کے عام آدمی کے لیے مشکل بنا دی ہے۔ یہاں تک کہ فاضل جج صاحب بھی سنسکرت سے واقفیت کے باوجود اسے نہیں سمجھ سکتے۔ تو ایسی صورت میں اردو کا سنسکرت سے اپنائیت ذرا مشکل ہے۔ اردو نے سنسکرت کے الفاظ کا وہی حصہ اپنے اندر سمویا ہے جو عام ہندو پاک کے عام آدمی کے لیے قابل فہم ہے اور یہ عمل صدیوں میں ہوا ہے۔

۱۶۔ ہندوستان میں اردو شعرا کے کلام کی اشاعت تو ویسے ہی دیوناگری رسم الخط میں ہی ہو رہی ہے یہاں فاضل جج کا موقف یہ ہونا چاہیے کہ ان کتب کی اشاعت دیوناگری رسم الخط کے ساتھ ساتھ اردو کے رسم الخط میں بھی کی جائے تا کہ ہندوستان کے اردو داں حضرات بھی اسے سمجھ سکیں۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ اردو شعرا کے مافی الضمیر کی تفہیم بھی زیادہ بہتر طریقے سے ہو سکے گی۔

۱۷۔ اردو فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے نہ کہ عربی رسم الخط میں۔ ان دونوں میں خاصا فرق ہے مگر یہاں اس بات کو موقع نہیں۔

Abstract

This essay aims at dispelling the common misconceptions in India about the language of Urdu and its tradition of rich literature. The misconceptions are: it a language of an alien land and a language of Muslims. In India, Urdu received a major dent in 1947 when it was dubbed a language of Muslims. Many people here in India shunned to use and learn the language and started using words of Sanskrit language. The essay highlights that these are the wrongly conceived notions and insufficient grounds are available to dub it so. In its earliest stage to the phase of its development, it remained here and represented the culture of this area providing solutions for the people's problems and above all touching the hearts of the people of India. Mir Taqi Mir and Nazeer Akbar Abadi in their poetry used many subjects of Hindi culture as they did not limit the language of Urdu to Muslims. This essay finds it the British colonists behind the misconceptions about Urdu among the Indian as they wanted to divide and rule. In summing it up, the writer of this essay advised the writers of Urdu should not only use the simple language but also go together with the Sanskrit. Then, Urdu can be saved from further damage in India.

Keywords: Urdu, Sanskrit, misconceptions about Urdu, Urdu as an alien language for Indians, wrongly conceived notions for Urdu in India, identity less Urdu language